مرثیہ

قطب شاہ سے ساحر تک

مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ اجتہادی، کراچی، پاکستان

بیان اپنا

برصغیر کے مشہور خانوادۂ علم وادب یعنی خاندان اجتہاد کے ایک نامور فرد نواب مولوی سید اصغر حسین صاحب فاخرؔ اعلی اللہ مقامہٗ ایک مانے ہوئے شاعر اور اتنے بلند مرتبہ مرثیہ گو تھے کہ خاندان انیسؔ میں ان کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ کثیر التلامذہ اور صاحب دواوین تھے۔ کم سے کم پانچ دیوان غزلیات کے شائع ہوئے۔ ہر صنفِ سخن پر قادر تھے۔ زیادہ توجہ غزل اور مرثیہ کی جانب تھی۔

لکھنؤ کے ایک اور باکمال ذی شرف شاعر نواب سید محمد ذکی علی صاحب ہاتفؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی صاحب زادی حضرتِ فاخرؔ اعلی اللہ مقامہٗ کے پوتے نواب سید اختر حسین صاحب مصورؔ اعلی اللہ مقامہٗ سے منسوب ہوئیں۔ یہ دونوں بزرگوار میرے محترم والدین ہوئے۔

۶ ستمبر ۱۹۳۱ء کو زیارتِ مقاماتِ مقدسہ کے سفر کے دوران کراچی میں اس دنیا میں قدم رکھا، بچپن ہی میں زیارت سے مشرف ہوا۔ ہجرت سے پہلے لکھنؤ ہی میں بسر ہوئی۔ وہیں سے میٹرک کا امتحان فرسٹ کلاس میں پاس کر کے کراچی آ گیا۔ یہاں اسلامیہ کالج سے بی اے اور ایس ایم لا کالج سے قانون میں درجہ اول کی سند لی۔ کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ صنعتی اور مزدور قوانین کے ڈپلومہ کے امتحان میں پورے پاکستان میں اول آیا۔

لکھنؤ میں گھر کی ادبی فضا نے بچپن ہی میں ذوق شعری کو پروان چڑھایا۔ والد مرحوم کے علاوہ میرے دونوں چچا یعنی نواب سید افسر حسین صاحب افسرؔ مدظلہ العالی اور نواب سید افخر حسین افخرؔ مدظلہ العالی، پھوپھا یعنی کنور حسن عباس صاحب عباسؔ مدظلہ العالی رئیس ٹانڈہ حتیٰ کہ والدۂ گرامی قدر اور بعض دوسری خواتین بھی شعر کہتی تھیں۔ تقریباً ہر روز شام کو ایک نشست ہوتی اور جس جس نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ سنا دیتا۔ اس ماحول نے شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔ ابتدا سلام سے کی اور اصلاح کے لئے عم محترم لسان الشعراء مولوی سید اولاد حسین صاحب عرف مولوی للن صاحب شاعرؔ اعلی اللہ مقامہٗ کی خدمت میں پیش کیا۔ جب انہوں نے لکھنؤ کی سکونت ترک کی تو اس کے بعد جب تک لکھنؤ میں رہا، حسینی شاعر حضرت فضلؔ نقوی مدظلہ العالی مدیر ''نظارہ'' سے اصلاح لیتا رہا۔ یہ دونوں بزرگوار حضرتِ فاخرؔ اعلی اللہ مقامہٗ کے بھانجے اور جانشین یعنی دعبل ہند حضرتِ ذاخرؔ اعلی اللہ مقامہ کے نامور فرزند اور شاعری میں ملک گیر شہرت کے مالک ہوئے۔ حضرتِ فضلؔ نقوی مدظلہ العالی رشتہ میں میرے چچا بھی تھے اور پھوپھا بھی اور شاعری میں ایک انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے استاد بھی۔ اگر ان کی مشفقانہ رہنمائی نصیب نہ ہوتی تو میری زندگی کا یہ باب شروع ہوتے ہی ختم ہو جاتا۔

کراچی آنے کے بعد تقریباً ۱۹۶۸ء تک شاعری کا سلسلہ منقطع رہا۔ بالآخر میرے ایک انتہائی کرم فرما اور اس عہد کے ایک بلند پایہ شاعر حضرتِ ظفرؔ جون پوری مدظلہ العالی لکچرار کراچی یونیورسٹی نے بقول شخصے مار مار کر مجھ سے شعر کہلوانا شروع کیا۔

اس طرح تقریباً بارہ برس کے تعطل کے بعد میری شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا۔ اس دور میں رہ نمائی اور مشورہ سخن کے لئے شاعر آلِ محمد حضرتِ نسیمؔ امروہوی مدظلہ العالی سے استفادہ کیا۔ ان کی ذاتِ گرامی شعر وادب خصوصاً مرثیہ کے میدان میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

اس دوسرے دور میں بنیادی طور پر توجہ قصیدہ کی طرف رہی۔ ۱۹۷۵ء میں علاوہ اور بزرگوں اور دوستوں کے اپنے ایک انتہائی شفیق اور محبت کرنے والے بزرگ اور اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مرثیہ نگار حضرت عزمؔ جونپوری مرحوم کی پیہم ہمت افزائی اور حضرتِ نسیمؔ امروہوی مدظلہ کے ایماء پر مرثیہ کہنے کی جسارت کی، چنانچہ زیرنظر مرثیہ میرا پہلا مرثیہ ہے جو پہلی مرتبہ ۲۴ جنوری ۱۹۷۶ء مطابق ۲۱ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ بروز شنبہ جامعہ امامیہ کراچی میں پیش کیا۔ اس کے بعد دبستان انیسؔ اور ڈاکٹر اجمل مرحوم کی کوٹھی پر راولپنڈی کی ان دو مجالس میں اور قصرِ حسینی خیر پور میں نذرِ سامعین کرنے کے علاوہ متعدد جگہوں پر پڑھا۔

الحمد للہ کہ یہ مرثیہ ۱۹۷۷ء میں شائع ہوگیا۔ یہ میرے لئے باعثِ تشکر و امتنان تو ہے ہی لیکن مرثیہ کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے طالبانِ علم کے لئے بھی اس کی کچھ نہ کچھ افادیت ضرور ہے۔ اس کا موضوع ''مرثیہ'' ہے۔ میں نے اس میں اپنے طور پر یا اپنے لفظوں میں مرثیہ کی تعریف کی ہے۔ دیگر اصناف سخن کے مقابلہ میں اس کی اہمیت، مختصر تاریخ اور اسی ذیل میں مختلف ادوار اور مقامات کے کوئی ۱۲۰ مرثیہ گو شعراء کا ذکر کیا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ ایک کلام منظوم ہے، نثر نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں اتنی گنجائش نہیں کہ قلی قطب شاہ سے لے کر اس عہد تک جو سیکڑوں مرثیہ گو شعراء گذرے ہیں، ان سب کے نام اس میں شامل کئے جاسکیں۔ لہٰذا ان تمام مرثیہ گو شعراء اور ان کے مداحین سے جو پاک و ہند کے کسی بھی علاقہ سے علاقہ رکھتے ہوں، دست بستہ یہ گذارش ہے کہ کسی نام کی عدم شمولیت کو دل شکنی کا باعث نہ سمجھیں۔ اور ہرگز یہ خیال نہ فرمائیں کہ متعلقہ مرثیہ گو کے مرتبہ کو نظرانداز کرنے کی جسارت کی گئی ہے۔ اس کی وجہ محض نظم کی تنگ دامنی اور میرا جہل ہے۔

اس مرثیہ میں جن مرثیہ نگاروں کے نام آئے ہیں، ان کے مختصر حالات پر مشتمل ایک اشاریہ مرثیہ کے آخر میں حروف تہجی کے اعتبار سے شامل کردیا گیا ہے جس سے طالبان علم کے لئے اس مرثیہ کی افادیت خاطر خواہ طور پر بڑھ گئی ہے۔ یہ اشاریہ ڈاکٹر ہلال نقوی نے مرتب کیا ہے، جو اس وقت مرثیہ کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کے لئے ریسرچ کررہے تھے اور اس لئے یہ اشاریہ مرتب کرنا انھیں کے لئے موزوں تھا میں ان کی اس زحمت کے لئے تہِ دل سے شکرگذار ہوں۔

یہ مرثیہ صاحبانِ نقد ونظر کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ تو وہ خود کریں گے، میرے لئے کچھ عرض کرنا بے محل ہے۔ البتہ اس عہد کے ایک عظیم صحافی، شاعر نقاد اور مشہور ادیب رئیس القلم جناب رئیسؔ امروہوی مدظلہ العالی نے جواب بدقسمتی سے اس دنیا میں نہیں ہیں، اپنی شدید مصروفیات کے باوجود اس مرثیہ کے متعلق لکھنے کی زحمت فرمائی۔ گوکہ وہ مجھ سے اس حد تک ناواقف تھے کہ صورت آشنا بھی نہ تھے۔ یہ زحمت میرے لئے وجہِ افتخار بھی تھی اور سپاس گذاری کی متقاضی بھی۔

والسلام

سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ لکھنوی

دانش منزل، ۴۴-اے بلاک ۱۳ گلشن اقبال، کراچی

نوٹ:- یہ پیش لفظ اس مرثیہ کی اشاعتِ اول کے لئے لکھا گیا تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باعث اب اس میں کچھ ترامیم ناگزیر ہوگئیں جو کردی گئی ہیں۔

ساحرؔ

رثائی ادب میں نادر اضافہ

جناب رئیسؔ امروہوی صاحب

''ادب'' آفاقی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ ہر زبان کے لئے اس کا آفاقی ادب سرمایۂ نازش اور مبدءِ تخلیق ہوا کرتا ہے۔ اردو میں مرثیہ نگاری کی صنفِ سخن بھی آفاقی حیثیت رکھتی ہے اور اپنے موضوع کی وسعت اور تنوع کے لحاظ سے امتیاز خاص کی حامل ہے۔ اردو کی تمام اصنافِ سخن پر عربی و فارسی اثرات کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، البتہ مرثیہ نگاری وہ تنہا صنفِ سخن ہے جس نے غزل اور قصائد کی طرح فارسی و عربی اسالیبِ شعر کے اثرات کو قبول نہیں کیا۔ اس حقیقت کا ثبوت وہ ابتدائی مرثیے ہیں جن کا آغاز قلی قطب شاہ اور ان کے معاصرین کے عہد میں ہوا اور بعد میں انیس و دبیر جیسے قادرالکلام شعراء نے انہیں (اردو مراثی کو) معراج کمال تک پہنچا دیا۔ یہ مرثیے اپنے مزاج، مذاق اور اسالیبِ ابلاغ کے اعتبار سے کسی طرح فارسی و عربی اثرات کے مرہون منت نہیں۔ انیسؔ و دبیرؔ کے ہاتھوں درجۂ تکمیل پر فائز ہونے کے بعد اردو مرثیہ نے ہر صنف سخن کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اس طرح ہماری زبان کی شاعری میں ایک ایسی صنف سخن وجود میں آئی جس کی مثال کسی زبان کے ادب میں نہیں ملتی۔ اردو مرثیہ کا ایپک (EPIC) اور ٹریجڈی (TRAGEDY) سے تقابل کرنے والے یہ توضیح کہتے ہیں کہ اردو مرثیہ نہ ایپک سے تعلق رکھتا ہے نہ ٹریجڈی سے۔ اس لئے کہ یہ خود ایک مکمل، مستقل اور منفرد صنفِ سخن ہے۔ البتہ ایپک ہو یا ٹریجڈی، ان دونوں کی خصوصیات اردو مرثیہ میں موجود ہیں۔

اردو مرثیہ کے متعلق اس گفتگو کا سبب یہ ہے کہ ساحرؔ لکھنوی کے زیر نظر مرثیہ کا موضوع ہی اردو مرثیہ ہے۔ اردو مرثیہ کیا ہے؟ لغوی اور اصطلاحی تعریف کے ساتھ ساتھ شاعرانہ فکر کے اعتبار سے مرثیہ کی تعریف کیا ہے؟ اردو مرثیہ کی ابتداء کس نے کی؟ اس کے ارتقائی سفر کی منزلیں کیا تھیں؟ مرثیہ کے ابتدائی دور سے عہد جدید تک مختلف ادوار کے نمائندہ مرثیہ نگار کون کون تھے؟ ساحرؔ نے اس مرثیہ میں ان سب حقائق پر بڑے محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح یہ مرثیہ ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ آپ اس کو مرثیہ کی اجمالی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخ ساز کام کیا گیا ہے جس کی اہمیت کو صرف طالبان علم اور مرثیہ سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین ہی نہیں بلکہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے بھی محسوس کریں گے۔ یقینا یہ مرثیہ ایک ریفرنس بک (REFERENCE BOOK) کے طور پر کام آ سکتا ہے۔

ساحرؔ لکھنوی جس خانوادۂ علم و ادب سے تعلق رکھتے ہیں، اس میں نہ صرف جناب غفراں مآب علیہ الرحمہ اور سلطان العلماء سے لیکر اب تک متعدد جید مجتہدین اور علمائے کرام پیدا ہوئے بلکہ شعر و ادب میں بھی مہدی حسین ماہرؔ، اصغر حسین فاخرؔ، بندہ کاظم جاویدؔ، صادق علی چھنگا صاحب حسینؔ، سید محمد اصطفی خورشیدؔ، سید محمد جعفر امیدؔ، صادق حسین عقیلؔ، ساجد حسین فہیمؔ، اولاد حسین شاعرؔ، ظفر عباس فضلؔ اور اختر حسین مصورؔ جیسے بلند پایہ مرثیہ نگار اور نوحہ گو شاعر پیدا ہوئے، جن میں سے بعض صاحبِ دواوین بھی ہیں۔ اس لحاظ سے شاعری اور مرثیہ نگاری ان کا خاندانی ورثہ ہے۔ سونے پر سہاگہ، انھیں دورِ حاضر کے منفرد مرثیہ گو شاعر آل محمد حضرتِ نسیمؔ امروہوی کے مشورہ اور رہ نمائی کا شرف بھی حاصل ہے۔

ساحرؔ کا زیرِ نظر مرثیہ اپنے عنوان کے اعتبار سے جدید اور اپنے اجزائے ترکیبی کے اعتبار سے کلاسیکی انداز کا مرثیہ ہے۔

کلاسیکی مرثیہ کو انیسؔ و دبیرؔ نے اس بلندی پر پہنچا دیا تھا کہ

اس کے بعد بظاہر کوئی منزل نہ تھی۔ کلاسیکی مرثیہ کے دو اہم اجزاء یعنی تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں کوئی گوشہ چھوڑا نہیں گیا، جس کی وجہ سے اس بارے میں کوئی نئی بات کہنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے اور عام طور پر جو کچھ کہا جاتا ہے، وہ محض انیسؔ و دبیرؔ کی صدائے بازگشت معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے مرثیہ نگاروں نے کلاسیکی مرثیہ کے ان اجزاء کو تقریباً ترک کر دیا ہے اور اب پورے برصغیر میں سوائے دو چار اساتذہ کے کوئی اس موضوع پر قلم نہیں اٹھاتا۔ ساحرؔ نے اس مرثیہ میں تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں نہایت کامیابی کے ساتھ بعض نئی تشبیہات استعمال کی ہیں جن کو بجا طور پر اس باب میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً تلوار کی تعریف میں:

کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرؑ کرّار بن گئی

گھوڑے کی تعریف میں:

اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف، براق، برق، تجلی، نظر، خیال

اسی طرح:

اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سر کرے

بالکل عہدِ جدید کی بات ہے اور خلائی سفر کے اس دور میں ہی کہی جاسکتی تھی۔ یا:

اس کو جو آپ ہٹ کے نہ رستہ پہاڑ دے
ٹاپوں سے مار مار کے صورت بگاڑ دے

نہ صرف نیا انداز اور نیا آہنگ لئے ہوئے ہے بلکہ جذبہ کی توانائی کی بھرپور عکاسی بھی کرتا ہے۔

اس مشکل اور پامال موضوع پر اتنی کامیابی سے قلم اٹھانا ساحرؔ کی ندرتِ خیال قوتِ فکر اور قدرتِ نظم کی روشن دلیل ہے۔

مرثیہ کے دوسرے حصہ میں امام حسینؑ کے اٹھارہ برس کے نورِ نظر جنابِ علی اکبر کا حال نظم کیا گیا ہے جو رخصت، آمد، رجز، جنگ اور شہادت پر مشتمل ہے۔ اسی اعتبار سے میں نے اس کو کلاسیکی طرز کا مرثیہ بھی کہا ہے۔ رخصت اور شہادت کے حصے نہایت دل گداز اور اثر انگیز ہیں۔ حضرت علی اکبرؑ کی جنگ اور میدان جنگ کی منظر نگاری کے حصے رنگ و آہنگ کا حسین امتزاج ہیں جن کو پڑھ کے بے ساختہ منہہ سے واہ نکل جاتی ہے۔ یہ بند ملاحظہ کیجئے:

حضرتِ علی اکبرؑ فوجِ شام پر حملے کر رہے تھے اور ان کی شمشیر جوہر وار دشمن پر قہرِ خدا بن کر گر رہی تھی۔

یہ تیغ اور کیا تھی جو قہرِ خدا نہ تھی
باطل سے اس کے دل میں مروت ذرا نہ تھی
سچ مچ ہلاک کرتی تھی، عشوہ نما نہ تھی
ہم شانِ ذوالفقار تھی، تیغِ ادا نہ تھی
جھونکے چلے جو دشت میں ایسی حسام کے
بجھنے لگے چراغ سویرے سے شام کے

نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے، فوجِ شام بھاگ کھڑی ہوئی اور میدان جنگ میں بلا کی افراتفری مچ گئی۔

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی، سپر کہیں
رہرو کہیں تھے، راہ کہیں، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی، پاؤں کہیں تھے، نظر کہیں
پیدل تو کیا، سوار گرے اضطراب میں
سر خاک پر تھے، پاؤں معلق رکاب میں

محشر سے ہم کنار تھا میدانِ کارزار
نقارہ و دہل کی گرج، شورِ گیر و دار
چیخیں وہ زخمیوں کی وہ کڑکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست و خیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبرؑ کی تیغِ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے

بکھرے پڑے تھے دشتِ وغا میں اِدھر اُدھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر سب تر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لئے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لئے

ان بندوں میں زورِ بیان عروج پر ہے، منظر نگاری اتنی خوب صورت ہے کہ ذرا سے تصور کے سہارے میدان جنگ کا پورا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں ۔ حسبِ محل مرثیہ کی کلاسیکی زبان بھی استعمال کی گئی ہے مگر مصرعوں کی بندشیں ، خیالات اور اندازِ بیان بالکل منفرد اور اچھوتا ہے ۔ دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹھوکروں میں آنے والے بریدہ سروں کے لئے یہ کہنا کہ

گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لئے

ندرتِ خیال اور پروازِ تخیل کی ایک حسین مثال ہے۔

مختصر یہ کہ ساحرؔ لکھنوی کا یہ مرثیہ اردو کے رثائی ادب میں ایک خوبصورت اضافہ بھی ہے اور ایک مفید دستاویز بھی۔

آخر میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ جدید مرثیہ کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کلاسیکی انداز کے مرثیے بھی کہے جاتے رہیں تا کہ اردو رثائی ادب کے شان دار ماضی سے بھی ہمارا رشتہ استوار رہے اور ہم اس عظیم کلاسیکی ورثہ سے محروم نہ ہونے پائیں اور جدید مرثیہ کی ترقی کی کوششوں میں ان چراغوں سے روشنی حاصل کرتے رہیں جو اردو رثائی ادب کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں۔

دستخط (رئیسؔ)

۷ دسمبر ۱۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قطب شاہ سے ساحر تک

تعداد بند (۱۰۳)

مولوی سید قائم مہدی نقوی ساحرؔ اجتہادی

(۱)

ذوقِ سخن تجلیٔ ایوانِ زندگی
شانہ کشِ عروسِ شبستانِ زندگی
زیبائشِ بہارِ خیابانِ زندگی
عطرِ حیات ، روح نفس ، جانِ زندگی
سارا شرف کلام کی شائستگی سے ہے
انسان کائنات میں افضل اسی سے ہے

(۲)

شیریں کلام لہجۂ عجز و نیاز میں
جیسے صدا بلال کی صحنِ حجاز میں
ناواقفانِ رمزِ سخن ، بزمِ ناز میں
ایسے ہیں جیسے ٹوٹے ہوئے تار ساز میں
گونگے ہیں، خوف جہل سے لب کھولتے نہیں
منہہ میں زبان رکھتے ہیں اور بولتے نہیں

(۳)

لطفِ حیات لذتِ شعر و سخن میں ہے
تاثیر ذکر فکر ہی کے بانکپن میں ہے
بوئے لباسِ حور اسی پیرہن میں ہے
رعنائیٔ خیال اسی انجمن میں ہے
اہلِ نظر کی بزم میں اُس کا گزر نہیں
جس کو یہاں سلیقۂ عرضِ ہنر نہیں

(۴)

عرفانِ کردگار ہے عنوانِ شاعری
خالق کی حمد ، مطلعِ دیوانِ شاعری
نعتِ رسولؐ منزلِ ایمانِ شاعری
پھر اس کے بعد مدحِ علیؑ جانِ شاعری
زہراؑ کی ہو ثنا کہ صفت ان کے لال کی
تطہیر نفس کی ہے طہارت خیال کی

(۵)

وہ حمد ہو کہ نعت ، وہ مدحت ہو یا ثنا
ہر ایک کا ہے اپنی جگہ اپنا مرتبا
لیکن یہ کہہ رہے ہیں تنوع ، اثر ، ادا
ہر ایک صنفِ شعر پہ حاوی ہے مرثیا
میدان اس کا اتنا وسیع و بسیط ہے
اصنافِ کل سخن پہ یہ تنہا محیط ہے

(۶)

اس میں غزل کا حسن ، قصیدے کی دل کشی
مدحت کی آن بان ، عقیدت کی چاشنی
حمدِ خدا کا لطف بھی ، نعتِ رسولؐ بھی
پھیلاؤ میں ہے نظم ، تسلسل میں مثنوی
غم بھی ہے، بزم ورزم بھی ہے، ہمہمہ بھی ہے
یہ داستانِ درد بھی ہے ، زمزمہ بھی ہے

(۷)

مومن کے حق میں رحمتِ باری ہے مرثیہ
گوشِ ستم پہ ضربت کاری ہے مرثیہ
دربارِ فن میں پنج ہزاری ہے مرثیہ
ملکِ سخن میں لاکھ پہ بھاری ہے مرثیہ
اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لئے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لئے

(۸)

دریائے فکر و فن کی روانی ہے مرثیہ
تیغِ زبانِ شعر کا پانی ہے مرثیہ
لیلائے شاعری کی جوانی ہے مرثیہ
تاریخ نے کہی وہ کہانی ہے مرثیہ
ہے فردِ جرمِ فوجِ ضلالت شعار بھی
کردارِ اہلِ بیتؑ کا آئینہ دار بھی

(۹)

میت کا ذکرِ خیر لغت میں ہے مرثیا
لیکن یہ اصطلاح میں ہے ذکرِ کربلا
وہ کربلا جو سب سے بڑا حق کا معرکا
وہ معرکہ جو معرکۂ صدق و کذب تھا
حق پر نثار ہونے کا جس نے سبق دیا
عزت کے ساتھ جینے کا انساں کو حق دیا

(۱۰)

وہ شام کے اندھیرے سے نورِ خدا کی جنگ
اہلِ دغا و مکر سے اہلِ وفا کی جنگ
طاغوتیت کے اوج سے عرشِ علا کی جنگ
اسلام کی بقا کے لئے کربلا کی جنگ
وہ صرصر وسموم سے پھولوں کی جنگ تھی
نیکی میں اور بدی میں اصولوں کی جنگ تھی

(۱۱)

اک سمت تھا یزیدِ بد اطوار و بد قماش
بے دین و بے اصول و بد اخلاق و بد معاش
اسلام دستِ ظلم سے جس کے تھا پاش پاش
کاندھے پہ رکھ کے عظمتِ انسانیت کی لاش
ٹھوکر کتابِ پاک پہ بھی مارتا ہوا
آیا تھا حق کے سامنے للکارتا ہوا

(۱۲)

اور دوسری طرف تھا محمدؐ کا نورِ عینؑ
قرآن ووحی و دین وشریعت کی زیب وزین
انسانیت کی آنکھوں کی ٹھنڈک، جگر کا چین
ایثار وصبر وعشق وصداقت کا دل، حسینؑ
حق کی بقا کا عزم مصمم کئے ہوئے
انسانیت کے اوج کا پرچم لئے ہوئے

(۱۳)

انسانیت کا دل ، جگر سرورِؐ نجف
زہرؑا کی جان ، احمدؐ مختار کا خلف
کعبہ کا افتخار ، براہیمؑ کا شرف
آیا جو کارزارِ شہادت میں سر بکف
سب خاک ہیں غرورِ حکومت ملا دیا
مظلومیت کے نام کا سکہ چلا دیا

(۱۴)

تاریخ ساز وہ سرِ میدانِ کربلا
ظلم وستم کے منہہ پہ طمانچہ حسینؑ کا
آئینِ سرفرازئ انساں جو بن گیا
تشریحِ معتبر ہے اسی کی یہ مرثیا
فرقِ ملوکیت کے لئے ضربِ سنگ ہے
ہر ظلم کے خلاف یہ اعلانِ جنگ ہے

(۱۵)

اس جنگ کا نقیب ، قطب شاہِ حق پناہ
مولا کا وہ فقیر ، دکن کا وہ بادشاہ
اردو ادب میں اس نے نکالی نئی یہ راہ
کی ابتدائے مرثیہ گوئی بہ اشک و آہ
یہ گلشنِ سخن میں نئی داغ بیل تھی
ورنہ غزل ازل سے تماشہ تھی ، کھیل تھی

(۱۶)

لے کر اٹھے تھے جس کو قطب شاہِ ذی حشم
تاریخ آگے بڑھنے لگی لے کے وہ علم
اس کے تلے گدؔا و سکندرؔ ہوئے بہم
بڑھتا رہا وہ جانبِ منزل قدم قدم
مسکین فن کی شمعِ فروزاں لئے ہوئے
چشم ونظر میں عترت وقرآں لئے ہوئے

(۱۷)

جذبے نے تجربات کی گودی میں پال کے
تیور جوان کر دیئے اس نونہال کے
ہیئت بدل کے، اک نئے سانچے میں ڈھال کے
تنقید کے بھنور سے نکالا سنبھال کے
میرؔ اس کو زیب میری و درائی کر گئے
سوداؔ تو اک زمانے کو سودائی کر گئے

(۱۸)

اس صنف میں کمال فصاحت تو دیکھئے
لہجے کے بانکپن میں متانت تو دیکھئے
منظر کشی میں ذہن کی جودت تو دیکھئے
جذبات کے بیاں میں حقیقت تو دیکھئے
مضمونِ حرب وضرب ہے اس آن بان کا
آہنگ ہے سخن میں کڑکتی کمان کا

(۱۹)

آغاز میں کلام کے شاعر بہ آب و تاب
چہرے سے مرثیے کے اٹھاتا ہے جب نقاب
چشمِ خیال دیکھتی ہے کچھ عجیب خواب
یہ ہے چمن، وہ دشت، یہ دریا تو وہ سراب
تڑکا یہ نور کا وہ سیاہی ہے شام کی
وہ لشکرِ یزید تو یہ فوج امامؑ کی

(۲۰)

منظور ہو نمودِ سحر کا اگر بیاں
کھینچے کچھ ایسے حسن سے وہ صبح کا سماں
بانگِ صریرِ کلک بنے نعرۂ اذاں
انگڑائی لے کے جاگ اٹھے پیر آسماں
لیلائے شب نقاب سے منھ ڈھانکنے لگے
گھونگھٹ سے صبحِ نو کی دلھن جھانکنے لگے

(۲۱)

گرمی کا ہو بیاں تو لرز جائے ہر نظر
نقطوں پہ ہو گمان کہ اڑ کر گرے شرر
لفظیں ہوں سب سیاہ یہ سوزش کا ہو اثر
لکھے ''سفر'' تو دیکھنے والا پڑھے ''سقر''
حدّت سے کھول جائے سیاہی دوات کی
عشرے کو جیسے دھوپ سے موجیں فرات کی

(۲۲)

رنگِ وغا جو بزم میں یہ اہلِ فن جمائیں
کانوں میں گونجنے لگے تیروں کی سائیں سائیں
سن سن سے تیغِ فکر کی جی سب کے سنسنائیں
کمزور دل تو چیخ اٹھیں کہہ کے ''ہائیں ہائیں''
دستِ خیال بندِ نظر بولنے لگے
گوشِ تصورات میں رن بولنے لگے

(۲۳)

چھڑ جائے ذکرِ غم تو فضائیں ہوں سوگوار
نکلے جو آہِ سرد ، ہوائیں ہوں بے قرار
نوحے کی جو بلند صدائیں ہوں بار بار
پامالئ چمن پہ گھٹائیں ہوں اشک بار
آنسو امڈ کے آئیں خیالات کی طرح
بارش ہو اشک درد کی برسات کی طرح

(۲۴)

قدرت یہ فکر و فن پہ ، قلم پر یہ اختیار
افضالِ پنجتن ہے بتائیدِ کردگار
اس رتبۂ بلند پہ ہے مرثیہ نگار
ملکِ سخن پہ اس کا مکمل ہے اقتدار
دنیائے شاعری پہ حکومت اسی کی ہے
دینِ سخنوری میں امامت اسی کی ہے

(۲۵)

دلگیرؔ سے ہوئی اس امامت کی ابتدا
پہلے بھی مرثیہ تھا مگر یہ مزہ نہ تھا
پھر فیض ہے فصیحؔ و خلیقؔ و ضمیرؔ کا
وہ جن سے مرثیے کو ملا دبدبہ نیا
بخشا صلہ انہیں یہ جنابِ امیرؑ نے
چمکا دیئے ہیں نام انیسؔ و دبیرؔ نے

(۲۶)

دونوں نے مرثیے کو عجب مرتبا دیا
جیسے گدا کو خلعتِ شاہی پنہا دیا
چیونٹی کو اوج دے کے سلیماں بنا دیا
ایک بوریا نشیں کو فلک پر بٹھا دیا
یہ نظم صنفِ شعر کی سرتاج ہوگئی
گویا براقِ فکر کو معراج ہوگئی

(۲۷)

ان کی روش پہ اور بھی اہلِ ہمم چلے
عشقؔ سخن میں انسؔ و تعشقؔ بہم چلے
مونسؔ بہت نفیسؔ روش دم بدم چلے
کاملؔ بھی تھے رشیدؔ بھی جو ذی حشم چلے
ایسا وحیدؔ عصر جو ہر راہبر ہوا
اوجؔ سخن پہ فکر و نظر کا گزر ہوا

(۲۸)

پھولا پھلا جو اور یہ مولاؑ کا گلستاں
پہنچی صدائے مرثیہ گوئی کہاں کہاں
ہر قوم، ہر قبیلے میں کیا کیا تھے خوش زباں
نانکؔ، ریاضؔ، شادؔ، قلقؔ، وحشیؔ و بیاںؔ
خوشبو شمیمؔ کی چمنستانِ فن میں تھی
برجیسؔ کی ضیا بھی اسی انجمن میں تھی

(۲۹)

فائقؔ تھا ہر چمن سے چمن زارِ لکھنؤ
تھا کیا رفیعؔ طرۂ دستارِ لکھنؤ
فائزؔ اس اوجِ فکر پہ سرکارِ لکھنؤ
اخترؔ کا فیض جلوۂ دربارِ لکھنؤ
مثلِ قطبؔ قدیمؔ روش پر سجا ہوا
ایسا عروجؔ حسن کہ دولہا بنا ہوا

(۳۰)

کیسی بہار پر تھا گلستانِ لکھنؤ
اپنے پرائے سب تھے ثناخوانِ لکھنؤ
ثابتؔ کہ اک ستارۂ تابانِ لکھنؤ
وہ آرزوؔ کہ حاصلِ ارمانِ لکھنؤ
ایسے خبیرؔ بابِ خبر جن پہ ناز تھا
ایسے ذکیؔ کہ جن پہ فراستؔ کو ناز تھا

(۳۱)

تہذیبِ مرثیہ سے مہذبؔ وہ باشعور
ہوکے مودبؔ آئے تھے اس بزم کے حضور
عارفؔ کے روئے فکر پہ تھا معرفت کا نور
آشفتہؔ و جلیلؔ کا شہرہ تھا دور دور
ہر ایک اپنے فن میں جو فردِ فریدؔ تھا
اس نظم کے بیاں میں اثرؔ بھی شدیدؔ تھا

(۳۲)

ہیں ان کے ماسوا بھی کئی سو وہ نیک نام
جن کو ملی ہے مرثیے سے عظمتِ دوام
کچھ فن کے مقتدی ہیں جوان میں تو کچھ امام
کچھ نجمؔ ہیں فلک کے تو کچھ ہیں مہِ تمام
ہیں پاس کے بھی، دور سے آئے بھی ہیں بہت
اپنے ہی سب نہیں ہیں، پرائے بھی ہیں بہت

(۳۳)

اپنے ہوں یا پرائے، سب اس بزم کے جلیسؔ
یا پیروِ دبیرؔ ہیں یا پیروِ انیسؔ
افکار، پاک وصاف، زباں سادہ وسلیسؔ
مضمون پرشکوہ، سخن نادر و نفیسؔ
یوں ہے نگاہِ شوق میں ان کے سخن کا حسن
دولہا نے جیسے دیکھ لیا ہو دلہن کا حسن

(۳۴)

اک میرے جد، وہ حضرت فاخرؔ سے ذی وقار
میرے لئے شرف تو بزرگوں کا افتخار
ماہر تھے فنِ شعر میں ماہرؔ کی یادگار
مداح ان کے لاکھ تو شاگرد بے شمار
چلتی تھی ان کی تیغِ قلم ہر زمین میں
جبریل فن کے ڈھونڈھتی تھی پر زمین میں

(۳۵)

میرے بزرگ اور بھی تھے شاد و بامراد
امیدؔگاہ علم و ہنر جن کا اجتہاد
خورشیدؔ سے عقیلؔ و فہیمؔ و ادب نہاد
ذاخرؔ، حسینؔ، شاعرؔ و جاویدؔ حق نژاد
میں نے مذاقِ شعر جو پایا، انہیں کا ہے
ورثہ یہ ہاتھوں ہاتھ جو آیا، انہیں کا ہے

(۳۶)

کچھ اور بھی یہاں تھے ثنا خوانِ با ہنر
اب گوشۂ مزار ہے تا حشر جن کا گھر
شوکتؔ ، ظریفؔ ، اطہرؔ و بنیادؔ مقتدرؔ
زیباؔ ، محبؔ ، ندیمؔ ، ثمرؔ ، نجمؔ اور قمرؔ
آغاؔ کہ خود سخن بھی ثنا و صفت کرے
منظورؔ اور وصیؔ کی خدا مغفرت کرے

(۳۷)

محبوبؔ اور فارغؔ و زائرؔ سے بے بدل
صابرؔ ، نسیمؔ ساکن معمورۂ اجل
اصغرؔ، شہیدؔ، حبؔ، نظرؔ و حرؔ ہیں آج کل
جوہرؔ ہیں اور عظیمؔ سخندانِ باعمل
یہ سب بفیضِ آلِ محمدؐ وحیدؔ ہیں
حسبِ مذاق و فکر قدیمؔ و جدیدؔ ہیں

(۳۸)

رائقؔ ، جمیلؔ و فیضیؔ و شاداںؔ سے اہل فن
سردارؔ و اعظمیؔ و اثرؔ ، نیرؔ و حسنؔ
دانشؔ ، رئیسؔ ، صفدرؔ و حسانِ خوش سخن
قیصرؔ، قسیمؔ ، امیدؔ ، رضیؔ ، سب کا یہ چلن
تابش الگ الگ ہے مگر نور ایک ہے
اِس آسماں پہ جو بھی ستارہ ہے ، نیک ہے

(۳۹)

خاکیؔ و ہاشمیؔ و ہنرؔ بدرؔ اور ہلالؔ
فیضؔ و صباؔ و نوریؔ و کرارؔ خوش خیال
یاورؔ ، نفیسؔ ، شاہدؔ و منظرؔ شکر مقال
جوشؔ و رضاؔ و عزمؔ و ظفرؔ جیسے باکمال
مرشد مرے نسیمؔ حقیقت نگار ہیں
یہ گلشنِ ادب میں نسیمِ بہار ہیں

(۴۰)

صد شکر ، آج ان میں مرا بھی شمار ہے
ناچیز پر یہ رحمتِ پروردگار ہے
فکر جواں جو حسنِ سخن کا نکھار ہے
عزمِ ثنائے اکبرؑ عالی تبار ہے
اس میں مرا معین جو حق کا حبیب ہو
بزمِ سخن میں نور کا منبر نصیب ہو

(۴۱) مطلع ثانی

اکبرؑ ریاضِ حسنِ پیمبرؐ کے پھول ہیں
نخلِ شباب یہ ہیں ، وہ اصلِ اصول ہیں
یوسفؑ دعائے حسن ، یہ حسنِ قبول ہیں
صورت میں، چال ڈھال میں، بالکل رسولؐ ہیں
اس آئینے میں دیکھئے جلوہ رسولؐ کا
قامت کے رنگ و روپ میں سایہ رسولؐ کا

(۴۲)

ان کو اگر بٹھائیں محمدؐ کے رو برو
بالکل حضور ہی کا سراپا ہے مو بمو
شہرہ یہی ہے سارے زمانے میں کو بکو
یہ ہم شبیہِ احمد مرسلؐ ہیں ہو بہو
باتوں میں معرفت کے گہر رولتی ہوئی
تصویر ہے رسولؐ کی منھ بولتی ہوئی

(۴۳)

منھ بولتی ہوئی ہے یہ تصویر بے گماں
گویا دہن میں ان کے محمدؐ کی ہے زباں
عاشور کی وہ صبح ، تقدس کا وہ سماں
صحرا میں گونجتی ہوئی پر کیف وہ اذاں
ایک موج بن کے اشہد ان لا الہٰ کی
آواز آ رہی تھی رسالت پناہ کی

(۴۴)

جب دے چکا اذان وہ بانو کا مہ لقا
بڑھ کر نمازیوں نے مصلّی بچھا دیا
مولاؑ نے کی امامتِ انصارِ باوفا
اتنے میں فوجِ شر سے چلے تیر بے خطا
کیا کیا خوشی نہ تھی سپہ فتنہ ساز میں
کچھ ناصروں نے پائی شہادت نماز میں

(۴۵)

فارغ ہوئے نمازِ سحر سے جو تشنہ کام
روئے حسینؑ دیکھ کے ظلمِ سپاہِ شام
مڑ کر کہا ، دفاع کا جلدی ہو انتظام
پا کر امامِ وقت کی جانب سے اذنِ عام
انگڑائی لے کے، جوشِ شجاعت میں جھوم کے
عباسؑ اٹھے حضور کے قدموں کو چوم کے

(۴۶)

جھپٹے جلال میں صفتِ شیرِ خشمگیں
تیوری پہ بل ، نگاہ میں غصہ، جبیں پہ چیں
الٹی ہوئی وہ غیظ میں کہنی تک آستیں
حکم امامؑ ہو تو الٹ دیں ابھی زمیں
تیور بتا رہے ہیں جلالت پناہ کے
یہ ہیں ہزبر بیشۂ شیرِ الٰہ کے

(۴۷)

اکبرؑ یہ دیکھ کر ہوئے بے چین جو کمال
آئے حضورِ سرورؑ دیں صورتِ سوال
کی عرض ہاتھ جوڑ کے، اے سیدہؑ کے لال
اب وقت آ گیا ہے کہ آغاز ہو جدال
خادم یہ اوج پائے جو لطفِ امامؑ سے
ہو ابتدائے نصرتِ مولا غلام سے

(۴۸)

بیٹے نے باپ سے جو کہا دل کا مدعا
دھچکا لگا یہ شاہؑ کو ، جی سن سے ہوگیا
خود کو مگر سنبھال کے مظلوم نے کہا
ہمت کو آفریں ہے ، شجاعت کو مرحبا
ورثہ ہے یہ جلال شہؑ قلعہ گیر کا
پوتا ہے میرا شیر جنابِ امیرؑ کا

(۴۹)

لیکن یہ امر ہم کو قیامت سے کب ہے کم
پیری میں کس سے اٹھتا ہے کڑیل جواں کا غم
نانا کی یادگار ہو تم ، میرے ذی حشم
اہلِ حرم ہوں، دوست ہوں، انصار ہوں کہ ہم
نازاں ہیں اپنی خوبیٔ تقدیر دیکھ کر
جیتے ہیں سب رسولؐ کی تصویر دیکھ کر

(۵۰)

انصارؑ و اقرباؑ ہیں شجاع و وفا شعار
زیدؑ و حبیبؑ و عابسؑ و مسلمؑ سے باوقار
پھر سب سے بڑھ کے قاسمؑ و عباسؑ نامدار
جانے نہ دے گا رن کو تمھیں کوئی جاں نثار
تصویرِ مصطفیٰؐ سے کنارا کرے گا کون
تم سے جواں کی موت گوارا کرے گا کون

(۵۱)

اکبرؑ یہ سن کے چپ ہوئے، پھر ماں کے پاس آئے
سینے پہ ہاتھ، آنکھوں میں اشکِ الم چھپائے
پہلے تو چپ کھڑے رہے کچھ دیر سر جھکائے
آیا خیالِ خاطرِ مادر تو مسکرائے
منظر جو مامتا کے نگاہوں میں پھر گئے
کچھ کہہ نہ پائے ، دوڑ کے قدموں پہ گر گئے

(۵۲)

گھبرا گئی یہ دیکھ کے وہ غم کی مبتلا
بے تاب ہو کے چیخ اٹھی ، ہیں! یہ کیا ، یہ کیا
اے میرے لال ، میرے قمر ، میرے مہ لقا
جلدی کہو کہ پھٹتا ہے سینہ میں دل مرا
باتوں سے یاس کی مری جاں ، میری جاں نہ لو
اس دورِ ابتلا میں مرا امتحاں نہ لو

(۵۳)

اکبرؑ نے ہاتھ جوڑ کے مادر سے یہ کہا
آلِ نبیؐ کے خون کی پیاسی ہے کربلا
هَل مِن مُبارِزٍ کی اب آنے کو ہے صدا
دل چاہتا ہے پہلے میں بابا پہ ہوں فدا
لیکن پدر سے جنگ کی رخصت نہیں ملی
امّاں! امامؑ دیں سے اجازت نہیں ملی

(۵۴)

کیا ہو ، خدانخواستہ جو شہؑ پہ آنچ آئے
کیا ہو ، زمینِ دشت جو اک تازہ گل کھلائے
کیا ہو ، جو مجھ سے پہلے کوئی دوست رن کو جائے
کیا ہو ، جو یہ خبر کوئی اس ڈھنگ سے سنائے
اکبرؑ سے بڑھ کے اور کوئی کیا عزیز تھا
دنیا کہے گی باپ کو بیٹا عزیز تھا

(۵۵)

یہ ماجرا سنا تو وہ گھبرا کے رہ گئی
صورت پسر کی قلب کو تڑپا کے رہ گئی
چہرے کا رنگ دیکھ کے تھرّا کے رہ گئی
آیا اندھیرا آنکھوں میں ، چکرا کے رہ گئی
سنبھلی تو اٹھ کے گردِ پسر گھومنے لگی
رخ کی بلائیں لے کے جبیں چومنے لگی

(۵۶)

سینہ سے پھر لگا کے کہا ، ماں نثار ہو
اتنا نہ اشک بار ، نہ یوں بے قرار ہو
رخصت تمہاری کیوں نہ شہؑ دیں پہ بار ہو
اے میری جاں! رسولؐ کی تم یادگار ہو
ڈھارس بہت ہے تم سے شہِؑ مشرقین کو
پیارے بہت ہو لال مرے تم حسینؑ کو

(۵۷)

اچھا ، چلو ، پھوپھی سے اجازت دلائیں ہم
رخصت ملے تو لال کو دولہا بنائیں ہم
جوڑا شہانہ ہاتھ سے اپنے پہنائیں ہم
تم روٹھ جاؤ ماں سے تو تم کو منائیں ہم
بیٹا ، پھوپھی کے حق سے مرا حق سوا نہیں
میں کیسے اذن دوں جب انہوں نے دیا نہیں

(۵۸)

اتنے میں آئیں زینبؑ ناشاد خود وہاں
دیکھا تو روئے بانوئے شہؑ تھا دھواں دھواں
اک درد ، ایک کرب سا چہرے سے تھا عیاں
گھبرا کے پوچھنے لگی اکبرؑ سے نیم جاں
کیا بات ہوگئی ؟ مرے بھائی کی خیر ہو
امّاں کی عمر بھر کی کمائی کی خیر ہو

(۵۹)

اکبرؑ سے کچھ کہا نہ گیا ، چپ کھڑے رہے
بانوؑ یہ عرض کرنے لگیں ہاتھ جوڑ کے
آقا سے جنگ پر ہیں ستم گر تلے ہوئے
اذنِ جہاد چاہتے ہیں اب یہ آپ سے
اللہ شہؑ کے سر سے بلاؤں کو رد کرے
بیٹا جواں ہے ، کیوں نہ پدر کی مدد کرے

(۶۰)

زینبؑ تڑپ کے بولیں کہ اکبرؑ، نہیں نہیں
اے میرے لال، میرے گلِ تر، نہیں نہیں
یہ عمر اور نرغۂ لشکر ، نہیں نہیں
پالا تھا تم کو اس لئے دلبر، نہیں نہیں
اس ان گنے برس کا تصدق اتار دوں
تم پر میں اپنے عونؑ و محمدؑ کو وار دوں

(۶۱)

اکبرؑ یہ بات سنتے ہی مایوس ہوگئے
اور اس طرف حسینؑ کے جاں باز منچلے
ایک ایک کر کے طالبِ اذنِ وغا ہوئے
وہ جنگ کی کہ فوج کے چھکے چھڑا دیئے
وہ باگ روکنے سے جو حرؑ شرمسار تھا
دینے کو اپنی جان بہت بے قرار تھا

(۶۲)

پہلے اسی نے جان فدا کی حسینؑ پر
تھے اس کے ساتھ بھائی، غلام اور اک پسر
پھر ان کے بعد شاہؑ کے انصار خوش سیر
پہنچے حضورِ شاہؑ میں ہاتھوں پہ لے کے سر
سب نے شہید ہو کے سعادت حصول کی
ہر نذرِ پرُخلوص خدا نے قبول کی

(۶۳)

انصار ذبح ہوگئے، پیاروں نے جان دی
اک پھول پر چمن کی بہاروں نے جان دی
اک جانِ گلستاں پہ ہزاروں نے جان دی
خورشیدِ حق پہ چاند ستارواں نے جان دی
فرقت میں سب کی حال جو شہؑ کا تباہ تھا
مظلوم کی نظر میں زمانہ سیاہ تھا

(۶۴)

جب دوست کام آئے، عزیزوں نے کی مدد
کی اقربا نے نصرت مولا میں جدّ و کد
لاکھوں سے ایک ایک لڑا یوں بہ شدّ و مد
فوجِ عدو کے کشتوں کی کوئی رہی نہ حد
گنتی میں پیدلوں نہ سواروں کی بات ہے
ہے سیکڑوں کا ذکر، ہزاروں کی بات ہے

(۶۵)

لیکن وہ بے شمار، یہ کم اور بہت ہی کم
اور پھر یہ خستہ حال و پریشاں، وہ تازہ دم
پیاسے یہ تین دن کے، وہ غرق مئے حشم
یہ بھوک سے نڈھال، وہ سیراب و پرُ شکم
سر دے کے نام کر گئے سب مشرقین میں
بس اب جوان بیٹا ہے فوجِ حسینؑ میں

(۶۶)

اکبرؑ پھوپھی کے پاس پھر آئے پئے رضا
بانوؑ نے بھی پسر کی سفارش کو یہ کہا
اکبرؑ سے پہلے عونؑ و محمد ہوئے فدا
اب تک انہیں فدا نہ کیا، یہ مری خطا
طالب یہ اذن کے ہیں، میں عفو قصور کی
یہ آپ کے غلام، میں لونڈی حضور کی

(۶۷)

زینبؑ کلیجہ تھام کے چلائی، بی بیو
جاتا ہے رن کو باپ کا شیدائی، بی بیو
مرنے کی نوجواں نے قسم کھائی، بی بیو
گھر میں دلھن نہ آئی، اجل آئی، بی بیو
رخصت ہے اب شبیہ رسالت مآبؐ کی
لٹتی ہے حق کی راہ میں دولت شباب کی

(۶۸)

یہ سن کے اہلِ بیتؑ میں کہرام مچ گیا
وہ گریہ و بکا تھا کہ اک حشر تھا بپا
رخ کر کے سوئے نہر سکینہؑ نے دی صدا
بھیا چلے ہیں مرنے کو ، جلد آیئے چچا
روکا اگر نہ ان کو تو محشر اٹھاؤں گی
اب بھی اگر نہ آئے تو میں روٹھ جاؤں گی

(۶۹)

سن کر بہن کے بین شبیہ رسولؐ نے
اک سرد سرد آہ بھری دل کو تھام کے
گودی میں لے کے پیار کیا اتنے پیار سے
بچی بھی روئی ، خود علی اکبرؑ بھی رو دیئے
ساری فضا کو غم میں ڈبوتے ہوئے چلے
ننھے گلے کو چوم کے روتے ہوئے چلے

(۷۰)

چلنے لگے تو ماں نے کہا ضبط توڑ کے
جاتے ہو میرے لال مجھے بن میں چھوڑ کے
اکبرؑ نے ماں سے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کے
صغراؑ سے بھی تو آئے تھے ہم منھ کو موڑ کے
نرغہ ہے دشمنوں کا امامؑ انام پر
ہم کو نثار کیجئے امت کے نام پر

(۷۱)

ماں نے کہا کہ جاؤ ، مبارک سدھارنا
بیٹا! کسی بھی حال میں ہمت نہ ہارنا
نیزہ لگے جو سینہ پہ ، اس کو سہارنا
بابا کو وقتِ بد میں نہ لیکن پکارنا
کڑیل جواں ہو تم تو ، وہ پیرانہ سال ہیں
لونڈی کے تم پسر ہو ، وہ زہراؑ کے لال ہیں

(۷۲)

اکبرؑ یہ کہتے پیش پدر آئے شاد شاد
بابا ، خدا کا شکر کہ بر آگئی مراد
سب سے ملی ، اب آپ بھی دیں رخصتِ جہاد
راضی رضائے حق پہ ہوئے شاہؑ خوش نہاد
اکبرؑ جو اذن پا کے بہ عزم دگر چلے
شبیرؑ پیچھے پیچھے کمر تھام کر چلے

(۷۳)

اس شان سے تھا پشت فرس پر وہ مہ لقا
رف رف پہ جس طرح شبِ معراج مصطفاؐ
سر پر جو تھا عمامۂ سردار انبیاءؑ
بالکل نبیؐ کی شان تھی ، بالکل وہی ادا
دھوکہ ہوا جو رن میں نبیؐ کے ورود کا
غل پڑ گیا زمین و زماں میں درود کا

(۷۴)

جیسا سوار ویسا ہی رہوار خوش خصال
سرعت کو اس کی پائے ، تخیل کی کیا مجال
اسپِ فلک نورد کی رفتار کی مثال
رف رف ، براق ، برق ، تجلی ، نظر ، خیال
اک جست میں زمیں سے خلا تک سفر کرے
اک ثانیے میں چاند کی منزل کو سر کرے

(۷۵)

صیحہ کرے تو شیر کا پتا بھی پھاڑ دے
فوجوں میں رم کرے تو صفوں کو اجاڑ دے
اس کو جو آپ ہٹ کے نہ رستہ پہاڑ دے
ٹاپوں سے مار مار کے صورت بگاڑ دے
فرطِ غضب میں اس کی جبیں پر جو بل پڑیں
دہشت سے پیلِ مست کی آنکھیں نکل پڑیں

(۷۶)

تلوار میان میں ہے کہ بجلی ہے ابر میں
شہرہ ہے اس کی کاٹ کا ترسا و گبر میں
رکھتی ہے اختیار پہ بھی خود کو جبر میں
اکبرؑ کی یہ کنیز بھی فضہؑ ہے صبر میں
واقف جو ہے جہاد کے آدابِ عام سے
بے اذن کیا مجال جو نکلے نیام سے

(۷۷)

پہنچا اس آن بان سے رن میں جو وہ جری
دہشت سے پڑگئی دل اعدا میں تھرتھری
ڈالی نگاہِ غیظ جو لشکر پہ سرسری
شاہی کے اقتدار کے بت بول اٹھے ہری
نظروں کو تھا گماں کہ خدا کا حبیبؐ ہے
نکلے نبیؐ لحد سے ، قیامت قریب ہے

(۷۸)

اک اک سے کہہ رہا تھا کہ تعظیم کو بڑھو
حضرت کی پیشوائی کو ، تکریم کو بڑھو
اٹھو ، ادائے فرض میں تقدیم کو بڑھو
آداب کو ، سلام کو ، تسلیم کو بڑھو
سر رکھ دو اب قدم پہ رسولؐ انام کے
موتی لٹاؤ بڑھ کے درود و سلام کے

(۷۹)

یہ سن کے فوج کیں سے پرے کے پرے بڑھے
سینوں میں آلِ پاک سے کینہ بھرے بڑھے
تیغ و تبر پہ دستِ نحوست دھرے بڑھے
جھجکے ، چلے ، لرز گئے ، سہمے ، ڈرے ، بڑھے
پہچانی پاس آکے جو صورت دلیر کی
پھر تیغیں کھینچنے میں نہ ٹھٹھکے ، نہ دیر کی

(۸۰)

اکبرؑ بھی بہر جنگ فرس پر سنبھل گئے
اعدائے دیں جلال سے ان کے دہل گئے
تیور جو ان کے دیکھے تو چتون کے بل گئے
ضیغم کے آگے بزدلوں کے دم نکل گئے
نعرہ کیا کہ تن کے بڑھو گر دلیر ہو
آنکھیں ملاؤ ، سامنے آؤ جو شیر ہو

(۸۱)

ہم ہیں شجاع شہؑ کے علمدار کی طرح
بازو ملے ہیں جعفر طیارؑ کی طرح
باطل شکن ہیں حیدرؑ کرار کی طرح
تلوار توڑ دیتے ہیں زنار کی طرح
ہم ہیں ہزبر شیرِ خدا ، دیکھ لو ہمیں
تصویرِ مصطفیؐ ہیں ، ذرا دیکھ لو ہمیں

(۸۲)

امڈی یہ سن کے فوجِ ستم گر جو بے حساب
اک قہر بن کے ٹوٹ پڑا جانِ بوتراب
نکلے جری سے جنگ کو جو خانماں خراب
ان پر خدا کی مار تھی ، اللہ کا عذاب
تھی بھاگنے کی راہ ، نہ موقع لڑائی کا
ہر سمت ایک شور مچا تھا دُہائی کا

(۸۳)

تلوار شیر کی تھی کہ قتّالِ دہر تھی
اس کو چھوؤ تو آگ تھی ، چکھو تو زہر تھی
دریائے خوں کی موج تھی ، طوفاں کی لہر تھی
بھونچال تھی ، بلا تھی ، قیامت تھی ، قہر تھی
کھنچ کر مقابلے پہ جو باطل کے تن گئی
چینِ جبینِ حیدرِؑ کرار بن گئی

(۸۴)

یہ تیغ اور کیا تھی جو قہر خدا نہ تھی
باطل سے اس کے دل میں مروت ذرا نہ تھی
سچ مچ ہلاک کرتی تھی ، عشوہ نما نہ تھی
ہم شانِ ذوالفقار تھی ، تیغ ادا نہ تھی
جھونکے چلے جو دشت میں ایسی حسام کے
بجھنے لگے چراغ سویرے سے شام کے

(۸۵)

ہلچل یہ تھی کہ تیغ کہیں تھی ، سپر کہیں
رہرو کہیں تھے ، راہ کہیں ، راہبر کہیں
بھائی کہیں تھا ، باپ کہیں اور پسر کہیں
بھگدڑ مچی تھی ، پاؤں کہیں تھے ، نظر کہیں
پیدل تو کیا ، سوار گرے اضطراب میں
سر خاک پر تھے ، پاؤں معلق رکاب میں

(۸۶)

محشر سے ہم کنار تھا میدانِ کارزار
نقارہ و دہل کی گرج ، شورِ گیر و دار
چیخیں وہ زخمیوں کی ، وہ کڑکیت کی پکار
گھوڑوں کی جست وخیز سے اڑتا ہوا غبار
لاشے نظر کی آخری حد تک پڑے ہوئے
اکبرؑ کی تیغ تیز کے جھنڈے گڑے ہوئے

(۸۷)

بکھرے پڑے تھے دشت وغا میں اِدھر اُدھر
ہتھیار ، چار آئینے ، زرہیں ، جھلم ، سپر
دل ، ہاتھ ، پاؤں ، سینہ ، جگر ، سب تتر بتر
گھوڑوں کی ٹھوکروں میں تھے خیرہ سروں کے سر
جھکتے نہ تھے جو کبر سے اک آن کے لئے
گیندیں بنے تھے موت کی چوگان کے لئے

(۸۸)

چھینٹوں سے تھا لہو کی رخِ آفتاب سرخ
ہوتا ہے جیسے عکسِ شفق سے سحاب سرخ
جسموں پہ زخم تھے کہ کھلے تھے گلاب سرخ
بہتی تھی ہر سبوئے شکم سے شراب سرخ
فوّارے چھوٹ رہے تھے ، فضا لالہ زار تھی
دشتِ خزاں میں جوش پہ فصلِ بہار تھی

(۸۹)

برپا ابھی تھا دشت میں وہ شورِ دار وگیر
چلتے تھے چار سمت سے گرز و سنان و تیر
ناگہہ بن نمیر ستم گار و بے ضمیر
لے کر سنانِ ظلم چلا گھات میں شریر
چلائے انبیا یہ کلیجے سنبھال کے
تصویر مصطفیٰؐ ہے ، ذرا دیکھ بھال کے

(۹۰)

تھا وہ تو بے ضمیر و ستم گار و پر دغل
نیزہ چلایا ایسے کہ تھرّا گئی اجل
سینے میں گڑ کے رہ گیا موذی سناں کا پھل
اکبرؑ گرے زمین پہ گھوڑے سے منھ کے بل
جو آرزو تھی دل میں ، لہو بن کے بہہ گئی
مادر کلیجہ تھام کے ڈیوڑھی پہ رہ گئی

(۹۱)

گرتے ہی شاہؑ کو یہ صدا دی پکار کر
صد شکر ، کامیاب ہوا آپ کا پسر
خادم کو اب نہیں ہے تمنا کوئی ، مگر
بس دل یہ چاہتا تھا کہ مرنے سے پیشتر
دیدار شاہ دیںؑ کی سعادت حصول ہو
بابا ، سلام آخری میرا قبول ہو

(۹۲)

شبیرؑ نے سنی جو یہ آواز دل فگار
دوڑے یہ کہہ کے جانبِ میدانِ کارزار
لو ، الوداع ، اے مرے نانا کی یادگار
ہم سمجھے ، اس سلام کا مطلب ہے آشکار
کیسی جھجک یہ آخری زحمت کے واسطے
حاضر ہے باپ آپ کی خدمت کے واسطے

(۹۳)

یہ کہہ کے شاہؑ اشک بہاتے ہوئے چلے
بیٹے کے غم میں خاک اڑاتے ہوئے چلے
اک اک قدم پہ ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلے
فوجوں کو سامنے سے ہٹاتے ہوئے چلے
کھویا تھا نورِ چشم تو کچھ سوجھتا نہ تھا
منزل کہاں ہے ، راہ کدھر ، کچھ پتا نہ تھا

(۹۴)

ہر گام پر صدا تھی کہ اکبرؑ ، کہاں ہو تم
آؤں میں کس طرف ، مرے دلبر ، کہاں ہو تم
جائے کدھر یہ بے کس و مضطر ، کہاں ہو تم
بولو تو ہم شبیہ پیمبرؐ ، کہاں ہو تم
جلدی ہمیں پکار کے مشکل کو رد کرو
بیٹا! غریب باپ کی کچھ تو مدد کرو

(۹۵)

آئی صدا کہ آتے ہیں کیوں شاہِ کربلا
الجھا ہوا ہے قلب میں نیزہ تو کیا ہوا
نکلے گا آپ اور جو تڑپیں گے ہم ذرا
زحمت نہ آپ کیجئے ہم آپ پر فدا
کیا کیجئے گا آ کے یہاں اتنی دور سے
میت ہماری اٹھ نہ سکے گی حضور سے

(۹۶)

سن کر صدا جو شہؑ کو پسر کا پتا ملا
مقتل میں ہم شبیہ رسولؐ خدا ملا
اس حال میں حسینؑ کو وہ مہ لقا ملا
کڑیل جواں زمیں پہ تڑپتا ہوا ملا
گہرا سناں کا زخم تھا دل میں دلیر کے
نیزہ گڑا ہوا تھا کلیجے میں شیر کے

(۹۷)

رو کر کہا حسینؑ نے ، اکبرؑ ، ہم آئے ہیں
اٹھو مرے شبیہ پیمبرؐ ، ہم آئے ہیں
تم تک ہزار ٹھوکریں کھا کر ہم آئے ہیں
زینبؑ نے ہم کو بھیجا ہے دلبر ، ہم آئے ہیں
ماں کے پھوپھی کے پاس تمہیں لے کے جائیں گے
پیری میں اپنی قوت دل آزمائیں گے

(۹۸)

بیٹھے زمیں پہ ، گود میں بیٹے کا سر لیا
سینے سے پھر نکالنے کو نیزۂ جفا
کھینچی سناں ، سنبھال کے دل یا علیؑ کہا
کھنچ کر سناں کے ساتھ کلیجہ نکل پڑا
اک آہ کر کے باپ کی گودی میں مر گئے
مولا تڑپ کے رہ گئے ، اکبرؑ گذر گئے

(۹۹)

مظلوم نے شہیدوں کو آواز دی کہ آؤ
مسلمؑ ، حبیبؑ ، حر مرے اکبرؑ کی لاش اٹھاؤ
قاسمؑ ، کہاں ہو ، عون و محمدؑ کو ساتھ لاؤ
عباسؑ ، آ کے بھائی کی ہمت تو کچھ بڑھاؤ
مشکل کشائی کیجئے ، مشکل کشا علیؑ
ٹوٹی کمر پہ لاش اٹھاتا ہوں ، یا علیؑ

(بقیہ صفحہ ۲۰ پر ــــــــ)

سنتے ہو وہ جو میں سنتا ہوں اور دیکھتے ہو وہ جو میں دیکھتا ہوں۔ مگر تم نبی نہیں ہو۔ بے شک وزیر ہو۔"

حضرت علیؑ بن ابی طالب کے مرتبہ سے ناشناس افراد یقینا اس کو غلو سمجھیں گے مگر وہ ایک حقیقت ہے جسے امیر المومنینؑ نے رسولؐ اللہ کی زبانی بیان کیا ہے۔

یہ امیر المومنین علیؑ بن ابی طالبؑ کے اقوال و تعلیمات تمام مسلمانوں کی واقفیت کے لئے پیش ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ان اقوال پر غور کیا جائے تو مسلمانوں میں افتراق کی خلیجیں بہت کم ہو جائیں اور کم از کم وہ منافرت جو باہمی پائی جاتی ہے دور ہو جائے۔ کیونکہ یہ اس ہستی کے تعلیمات ہیں جو تمام مسلمانوں میں نقطۂ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے کسی نہ کسی درجہ پر تمام مسلمان امام خلق اور پیشوائے مطلق تسلیم کرتے ہیں۔

والسلام

علی نقی النقوی عفی عنہ

۱۰ / ربیع الثانی ۷۵ ۱۳ھ

❀❀❀

(بقیہ صفحہ ۲۶ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

میں تبدیل ہو رہی ہے، جس کے اثرات زبان و بیان، روزمرہ محاورات وغیرہ پر بھی مرتب ہو رہے ہیں، لہٰذا ترمیمات کے شعبہ ہائے زباندانی وغیرہ بھی اچھوتے نہیں رہ سکتے، مگر دہلی کی زباندانی بری طرح متاثر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ پاکستان کے ایک معروف ادیب و شاعر جو دہلی زباندانی کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں، عجیب اردو لکھتے ہیں۔ مثلاً ترجمہ گیتا میں ارجن کی بابت کہا ہے:

کھڑے سے ہو گیا بیٹھا

کیا اردو ہے! مولانا موصوف پر ایسی گرفت نہیں کی جاسکتی، اچھے شاعر اور بڑے ادیب ہیں۔ استاذی اثرؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، سرتیج بہادر سپرد، مسعود حسن رضوی ایسے پائے کے ادیبوں نے مولانا موصوف کے کام و نام کو سراہا ہے۔ ان مکتوبات پر مشتمل ایک تصنیف بھی شائع کی جانا چاہئے۔

(بقیہ صفحہ ۵۵ کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔)

(۱۰۰)

زینبؑ یہ سن کے خیمے سے نکلیں برہنہ پا
مقتل کی سمت دوڑ پڑیں دے کے یہ صدا
بھیا، میں آرہی ہوں، توقف کریں ذرا
عباسؑ سا وہ بھائی نہیں ہے تو کیا ہوا
میں رن سے اپنے لال کو خیمے میں لاؤں گی
ساتھ آپ کے جوان کی میت اٹھاؤں گی

(۱۰۱)

دیکھا بہن کو رن میں جو بے مقنع و ردا
شبیرؑ نے لرز کے کہا، کیا غضب کیا
زینبؑ، یہ کیا، ابھی تو ہے زندہ یہ بے نوا
ہم کو ابھی سے شام کا منظر دکھا دیا
خیمے میں جاؤ، بنتِ پیمبرؐ کا واسطہ
زینبؑ، تمہیں جوانیٔ اکبرؑ کا واسطہ

(۱۰۲)

پلٹی جو رن سے خیمے کو زہراؑ کی نورِ عین
لاشِ پسر اٹھا کے چلے شاہؑ مشرقین
عباسؑ ہیں نہ قاسمؑ و سعد و زہیر قین
فریاد از غریبی و بے یاری حسینؑ
اٹھو، چلیں کہ ہم ابھی زندہ ہیں، دوستو
مولاؑ جواں کی لاش پہ تنہا ہیں، دوستو

(۱۰۳)

ساحرؔ! بس اب خموش کہ ہے جوش پر بکا
پہلا یہ مرثیہ مرے مولاؑ کی ہے عطا
دستِ طلب بڑھا کے سوئے شاہؑ کربلا
کیجئے زبانِ فاخرؔ مغفور میں دعا
مطلب یہی ہے آپ سے بس اس حقیر کا
یا شاہ دیں! قبول ہو ہدیہ فقیر کا

ماخوذ از کتاب مجموعہ مراثی احساس غم، مصنفہ ساحرؔ اجتہادی

نوٹ: مرثیہ میں جن شعراء کے اسماء گرامی مذکور ہیں ان کے بالاختصار تذکرے آئندہ شمارہ میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے۔

(ادارہ)